نئی صدی کا چیلنج یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ جو محمد مصطفی ﷺ کے صافی دل پر نازل ہوا اس کو پھیلایا جائے

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۹ / اکتوبر ۱۹۹۰ء بمقام بیت الفضل لندن)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے فرمایا:

ابھی ایک سال سات ماہ کا عرصہ گزرا ہے کہ احمدیت اپنے قیام کی دوسری صدی میں داخل ہوئی اور اس تھوڑے ہی عرصے میں خدا تعالیٰ کے فضل اور رحم کے ساتھ ایسے آثار دکھائی دینے لگے ہیں کہ بفضلہٖ تعالیٰ یہ صدی احمدیت یعنی حقیقی اسلام کے غلبے کی صدی ثابت ہوگی۔ مختلف ممالک میں، مختلف قوموں میں جہاں اس سے پہلے احمدیت کے نفوذ کے رستے بند تھے نہ صرف یہ کہ رستے کھلے ہیں بلکہ احمدی عقائد احمدی خیالات، احمدی طرز فکر کو اپنانے کے لئے لوگ بے چین اور پیاسے دکھائی دیتے ہیں۔ ان تمام نئے علاقوں میں جہاں اس عرصے میں پہنچنے کی خدا تعالیٰ کے فضل کے ساتھ ہمیں توفیق ملی ہے جس تک بھی احمدیت کا پیغام پہنچا ہے اس نے دو طرح سے تعجب کا اظہار کیا ہے۔ ایک یہ کہ ہم اب تک اس سے کیوں محروم رکھے گئے؟ اور دوسرے یہ کہ بلا استثناء تمام نئی قوموں میں بھاری اکثریت نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ خیالات ہمارے اپنے دل کے خیالات ہیں ہمارے نزدیک مذہب ایسا ہی ہونا چاہئے ہمارے نزدیک اسلام کی یہی توجیہہ ہے جو فطرت کو قبول ہو سکتی ہے اور جس میں غالب آنے کی صلاحیت موجود ہے۔ ابھی تک ان میں سے بہت کم ہیں جن کو باقاعدہ احمدی ہونے کی توفیق ملی ہے یا اگر غیر مسلم تھے تو اسلام قبول کرنے کی توفیق ملی ہے

لیکن خیالات کی ہم آہنگی بہت ہی خوش آئند ہے اور آئندہ جماعت احمدیہ کے غلبے کے لئے بہت سی امیدیں پیدا کرتی ہے۔ جہاں تک احمدیت یعنی حقیقی اسلام کو قبول کرنے کا تعلق ہے اس کے لئے خیال کی ہم آہنگی ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کی راہ میں اور بہت سی روکیں ہیں، ان میں سے ایک روک کا میں نے گزشتہ کسی خطبے میں ذکر کیا تھا کہ وہ معاشرے کے اختلاف کی روک ہے۔

مغربی معاشرے نے ہی نہیں بلکہ دنیا کی دیگر بہت سی قوموں کے معاشروں نے بھی انسان کو اپنے رہن سہن میں ایسی لذتوں کی آزادی بخش دی ہے کہ اس میں گناہ کا خیال ان کے لذتوں کی پیروی کی راہ میں حائل نہیں ہوتا اور کوئی سماجی روک بھی ایسی نہیں جس کے نتیجے میں وہ بعض گناہوں سے باز رہنے پر مجبور ہوں یا باز رہنے کی طرف ان کا بے اختیار میلان ہو یا دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ سماج کے اثر کے نیچے باز نہ رہنا بھی چاہیں تو باز رہیں۔

پس یہ دو قسم کے نمایاں اثرات ہیں جو انسان کو بدیوں سے روکتے ہیں۔ ایک خدا کا تصور اور اس کے نتیجے میں گناہ کا خیال جو انسان کو بدیوں سے روکنے میں بہت حد تک کامیاب ہو سکتا ہے اگر خدا کا تصور حقیقی ہے تو گناہ کا خوف یعنی گناہ سے بچنے کا خیال بھی ایک حقیقی خیال بن جاتا ہے اور انسان کو بدیوں سے روکنے میں ایک بڑی قوت بن کر ابھرتا ہے۔ اگر خدا کا تصور واہمی سا ہو، اگر خدا کا تصور ایک بعید تصور ہو اور حقیقی اور سچا اور زندہ تصور نہ ہو تو اگر چہ گناہ کا تصور اس سے بھی پیدا ہوتا ہے لیکن وہ تصور بے اثر ثابت ہوتا ہے اور انسان عقلی طور پر ایک بات کو گناہ تسلیم کرتے ہوئے بھی اس سے باز رہنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ پس ان دونوں باتوں کا باہم گہرا رشتہ ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ ایک ایسا تعلق ہے کہ ایک اگر طاقت پکڑے گا تو دوسرا بھی طاقت پکڑے گا۔ پس خدا پر ایمان جتنا قوی ہوتا چلا جاتا ہے گناہ سے نفرت بھی اسی قدر قوی ہوتی چلی جاتی ہے یا اگر نفرت نہ ہو تو گناہ کا خوف اور گناہ سے بچنے کا رجحان اسی قدر زیادہ طاقتور ہوتا چلا جاتا ہے۔ پس ہمارا مقابلہ ایک پہلو سے دہریت سے ہے اور اسی دہریت کے نتیجے میں معاشروں کو آزادی ملتی ہے۔ جب گناہ کا تصور باقی نہ رہے تو معاشرے کے رنگ بدل جاتے ہیں۔

دوسری قوت جو انسان کو بدیوں سے روکتی ہے وہ سماج کی قوت ہے۔ بعض دفعہ گناہ کا خیال انسان کو کسی چیز سے نہیں روکتا بلکہ سماج کا دباؤ اس کو بعض چیزیں کرنے سے روکتا ہے اور سماج مختلف

ممالک اور مختلف قوموں کے مختلف ہیں۔ اب ایک ہندو سماج ہے اس سماج کا تصور ضروری نہیں کہ ان کے مذہب سے ہم آہنگ ہو بلکہ سماج ایک اپنا الگ رستہ چلتا ہے اور مذہب بعض دفعہ اس کے ساتھ متوازی بھی ہوتا ہے بعض دفعہ الگ ہٹ جایا کرتا ہے لیکن اس کے باوجود سماج قائم رہتا ہے جہاں مذاہب کمزور پڑ جائیں وہاں سماج طاقتور ہو جایا کرتے ہیں چنانچہ بہت سے افریقن ممالک میں خدا کے تصور کے لحاظ سے گناہ کا کوئی تصور نہیں مگر ان کا اپنا ایک سماج ہے اور اس سماج کا بڑا بھاری دباؤ ان قوموں پر ہے۔ وہ عام مذہبی نقطہ نگاہ سے گناہ کریں تو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں لیکن سماج کے خلاف بات نہیں کر سکتے اسی طرح تمام دنیا میں سماج کے دباؤ ہیں۔

مغربی معاشرہ بھی ایک سماج ہے اس کا نیکی اور بدی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا خدا کے تصور سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ قوم نے اپنا ایک رہن سہن بنالیا ہے جس پر مذہبی اثرات بہت ہی کم ہیں۔ لہٰذا جس معاشرے کو ہم عیسائی معاشرہ سمجھ رہے ہیں یہ درحقیقت عیسائی معاشرہ نہیں ہے بلکہ عیسائیت کے خلاف بغاوت کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ بہر حال جب ہم ان قوموں کو تبلیغ کرتے ہیں تو جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا تھا ہمارے سامنے اسلام کے مقابل پر عیسائیت کھڑی نہیں ہوتی۔ نہ اسے کھڑا ہونے کی طاقت ہے بلکہ اسلام کے مقابل پر مغربی سماج سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور ان قوموں کے لئے اپنے سماج کو چھوڑ کر مذہب کو قبول کرنا جو سماج میں بھی دخل انداز ہو اور سماج کے اطوار بدلنے کی کوشش کرتا ہو بہت ہی مشکل کام ہے۔ پس اس لحاظ سے اگلی ایک صدی کے جو مقابلے ہمارے درپیش ہیں ان میں ایک مقابلے کا میدان سماج کے ساتھ مقابلہ ہوگا۔ اور اس بارے میں مَیں نے پہلے آپ کو متنبہ کیا تھا کہ ہمیں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا اور بہت سوچ سمجھ کر سماج کی تعیین کرنی ہوگی۔ اگر پاکستانی یا دیگر قومی سماج کو ہم نے اسلام کا نام دے کر دوسری قوموں پر ٹھونسنے کی کوشش کی اور اس کے نتیجے میں ردعمل پیدا ہوئے اور انہوں نے اسلام کو رد کیا تو اس میں خدا کے نزدیک ہم ذمہ دار ٹھہریں گے۔ اگر ہم نے دوسری طرف سماج کو راضی کرنے کی خاطر اسلامی اقدار کو قربان کر دیا اور اس خطرے سے کہ کہیں اس وجہ سے یہ اسلام کو رد نہ کر دیں کہ اسلام ان کے سماج سے ٹکراتا ہے، اسلام میں تبدیلیاں کرنی شروع کر دیں تو پھر بھی یقیناً ہم نہ صرف ذمہ دار ہوں گے بلکہ بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کرنے والے ہوں گے۔ اسلام کو پھیلانا ہماری ذمہ داری ہے، یہ

فرض ہم پر عائد فرمایا گیا مگر اس طرح نہیں پھیلانا کہ گویا ہم اس مذہب کے مالک ہیں جس طرح چاہیں پھیلائیں ، پھیلانا مقصد ہے ۔ پھیلانا مقصد تو ہے مگر اسی اسلام کو پھیلانا مقصد ہے۔ جو آنحضرت ﷺ کے قلب صافی پر نازل ہوا تھا اور اس اسلام کی خدا تعالیٰ کو ایسی غیرت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تو ایک ذرہ بھر بھی اس اسلام سے الگ قدم رکھ دے، باہر قدم رکھ دے، کوئی تبدیلی اس میں منظور کر دے لیکن خدا تجھے متنبہ کرتا ہے کہ تیرے پاس یہ امانت ہے، ایک ذرہ بھی اس میں خیانت ہوئی اور اگر ایک شعشہ بھی تو نے اس دین سے باہر قدم رکھا جو میں نے نازل فرمایا ہے تو تُو سب کچھ کھو بیٹھے گا اور کہیں کا نہیں رہے گا۔ کتنی بڑی اور خوفناک وارننگ (warning) ہے، کتنا بڑا انتباہ ہے۔ دراصل آنحضرت ﷺ کے لئے تو ناممکن تھا کہ ایک ذرہ بھی اسلام سے انحراف کرتے بلکہ اس کے متعلق تصور بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ انسان یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ رسول اکرم ﷺ ایسی بات سوچ بھی سکتے تھے۔

پس خدا جب آپ کو مخاطب کر کے یوں فرماتا ہے تو تمام بنی نوع انسان سے تعلق رکھنے والی مختلف قوموں کو متنبہ فرماتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی اور ہے کہ جوں جوں اسلام نے مختلف قوموں میں پھیلنا تھا اسلام میں تبدیلی کے تقاضے پیدا ہونے تھے پس وہ اسلام جو تمام بنی نوع انسان میں پھیلا ہے اور مختلف قوموں میں اس نے نفوذ پکڑا، ان علاقوں کے مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ اپنے سماج سے تم نے اس رنگ میں صلح نہیں کرنی کہ اسلام کے اصولوں کو تبدیل کرو اور تبدیل ہونے دو بلکہ ایک ذرہ بھی تمہیں اس وجہ سے کہ لوگ تمہیں اچھا سمجھنے لگیں اسلام کو نرم دیکھ کر اسلام کو قبول کرنے لگ جائیں ان کی خاطر اپنے مذہب میں تبدیلی نہ کرو۔ یہ پیغام ہے جو آنحضرت ﷺ کی وساطت سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو پہنچایا گیا ہے۔

پس ہمارے لئے ایک پل صراط قائم کیا گیا ہے جہاں اگر دائیں طرف گریں تب بھی ہلاکت ہے بائیں طرف گریں تب بھی ہلاکت ہے ۔ ایک طرف اپنے معاشرے کو اگر وہ اسلامی نہیں، اسلامی معاشرے کے طور پر پیش کرنا بھی بڑا بھیانک جرم ہے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ردعمل پر ہم خدا کے حضور جوابدہ ہوں گے اور اگر اس وجہ سے اسلام قابل قبول نہیں رہے گا یعنی بعض قوموں کے لئے قابل قبول نہیں رہے گا تو اس میں سراسر ہمارا گناہ ہے اور اگر اسلام کو قابل قبول

بنانے کی خاطر ہم نے اسلام میں تبدیلیاں روا رکھیں تو یہ نہ صرف گناہ ہوگا بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر گناہ ہوگا اور بہت بڑی بددیانتی ہوگی اور اسلام کے ساتھ خیانت ہوگی جس کی خدا تعالیٰ اجازت نہیں دیتا۔ پس یہ وہ باریک راہ ہے جس پر چل کر ہم نے اس صدی میں دنیا کی مختلف قوموں کو اسلام پہنچانا ہے۔

ایک یہ بڑا خطرہ ہے جس کی میں نشاندہی کرنی چاہتا ہوں کیونکہ جوں جوں تیزی کے ساتھ ہم نئی قوموں میں پھیلیں گے۔ اسی قسم کے مطالبے بڑھتے چلے جائیں گے، اسی قسم کے تصادم ہوتے چلے جائیں گے اسی قسم کی الجھنیں ہمیں درپیش ہوں گی اور ان نئے تقاضوں کو صحیح معنوں میں پورا کرنے کے لئے یا ان نئے مقابلوں سے نپٹنے کے لئے ہمارے لئے کھلی ہوئی ایک واضح راہ ہونی چاہئے اور ہمیں پہلے سے ہی اس بات کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ پس اگر چہ یہ خطرات بعض جگہ ویسی ہی شدت کے ساتھ نہیں ابھر رہے لیکن چونکہ یہ ترقی اور غلبے کی صدی ہے اس لئے ہماری موجودہ نسل کو حکمت سے کام لیتے ہوئے آئندہ پیش آمدہ خطرات کے احتمالات کو سامنے رکھنا چاہئے۔ خطروں کے پیدا ہونے سے پہلے ان کے احتمال پر نظر رکھتے ہوئے ان کے خلاف تیاری کرنی چاہئے۔ قرآن کریم نے جو یہ حکم دیا ہے کہ سرحدوں پر گھوڑے باندھو۔ رَابِطُوْا فرمایا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سرحدوں پر اپنے گھوڑے باندھو۔ یہ سرحدیں مکانی بھی ہیں اور زمانی بھی ہیں۔ پس آئندہ زمانے کی سرحدیں وہ ہیں جن پر ہم آج کھڑے ہیں اور یہاں ہمیں گھوڑے باندھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں ہمیں مکمل طور پر اسلام کے دفاع کے لئے فوجی تیاری کی ضرورت ہے۔ پس جو خطرات آئندہ داخل ہو سکتے ہیں آج ان کے رستے بند کرنے ہیں۔ پس معاشرے کے معاملے میں جماعت احمدیہ کو خالصۃً اسلامی معاشرے کو صرف اختیار کرنا ہے بلکہ اسے خالص کر کے اختیار کرنا ہے اور اس میں دوسرے معاشروں کے نفوذ کے خطرات سے متنبہ رہنا ہے کیونکہ جب معاشرے معاشروں سے ملتے ہیں جس طرح گرم پانی ٹھنڈے پانی سے ملتا ہے تو نفوذ ضرور ہوتا ہے۔ بعض پہلوؤں سے بعض نفوذ ایسے ہیں جن کی اجازت دی جاسکتی ہے جہاں اسلام کے بنیادی اصولوں سے تصادم نہیں ہے، ٹکراؤ نہیں ہے، وہ ایک عام انسانی ترقی کے نتیجے میں بعض معاشرتی اصلاحیں ایسی ہوتی چلی جاتی ہیں جن کا مذاہب سے تصادم نہیں ہوتا۔

یہ مضمون اپنی ذات میں ایک الگ مضمون ہے۔ میں صرف اس طرف اشارہ کرتا ہوں کہ ہر وہ معاشرہ جو آپ کے معاشرے سے مختلف دکھائی دے لازماً رد کرنے کے لائق نہیں ہے۔ بلکہ بعض انسانی ترقی کا جو سلسلہ جاری ہے اس کے نتیجے میں بعض معاشرتی تبدیلیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں جو رہن سہن کے انداز سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کو غلط کہہ کے رد نہیں کیا جا سکتا۔ اب آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ایک رہن سہن تھا۔ بعض علماء جو تنگ نظری اختیار کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اسی قسم کی چادریں پہننا، اسی قسم کی چٹائیوں پر لیٹنا، اسی طرح کی شلواریں اور قمیصیں استعمال کرنا یہی اسلامی معاشرہ ہے اور یہ کہنے کے باوجود ان کا اپنا رہن سہن اس سے مختلف ہے۔ نہ ویسی ٹوپیاں پہنتے ہیں نہ ویسی غذا کھاتے ہیں۔ پھر اگر وہ اپنے اس عقیدے میں سچے ہوں تو ان کو پھر اسی طرح کھجوریں بھی کھانی چاہئیں اور اونٹ کا دودھ پینا چاہئے اگر اسی کا نام اسلامی معاشرہ ہے۔ تو یہ معاشرہ تو اب تمام دنیا میں رائج ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ نہ اتنے اونٹ ہیں نہ اتنی کھجوریں ہیں جن پر تمام بنی نوع انسان کے پیٹ بھر سکیں۔ پھر سواری بھی وہی اختیار کرنی چاہئے۔ پس جب میں یہ کہتا ہوں کہ بعض انسانوں میں ترقی سے تعلق رکھنے والی تبدیلیاں ہیں جو بعض پہلوؤں میں معاشرتی تبدیلیاں بھی بن جاتی ہیں ان کا مذہب سے تصادم نہیں ہوا کرتا۔ پس بڑے غور کے ساتھ اور فکر کے ساتھ ہمیں ان باتوں کا تجزیہ کر کے کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنی ہوگی۔ ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ کون سا معاشرہ حقیقت میں اسلامی معاشرہ ہے خواہ اس میں بعض ترقیاتی تبدیلیاں ہوں۔ کون سا معاشرہ غیر اسلامی معاشرہ ہو جاتا ہے خواہ وہ تبدیلیاں ہوں یا نہ ہوں، خواہ وہ ماضی سے تعلق رکھتا ہو۔ پس افریقن ممالک کی بہت سی معاشرتی باتیں ایسی ہیں جو ترقی سے نہیں بلکہ ماضی کے ادوار سے تعلق رکھتی ہیں اور وہ اسی حد تک غیر اسلامی ہیں جیسے آج پیدا ہونے والی معاشرے کی بعض باتیں غیر اسلامی ہیں تو زمانے کا تعلق نہیں ہے بلکہ روح دیکھنی ہوگی۔ مثلاً افریقہ میں بعض جگہ مذہب کے نام پر بعض جگہ روایات کے طور پر عورتوں کا ختنہ کرنے کا ایک ظالمانہ رواج ہے اس کے متعلق جو تفاصیل مَیں نے پڑھی ہیں وہ ایسی خوفناک ہیں کہ اس ظلم کو دیکھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی بچیوں پر ایسے ایسے مظالم کرتے ہیں اور یہ مظالم بعض دفعہ خدا کے نام پر، بعض دفعہ معاشرے کے نام پر کئے جاتے ہیں کہ انسان تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کس طرح کوئی اپنی معصوم بچیوں پر ایسا ظلم

کر سکتا ہے۔

پس یہ ماضی کی ایک بھیانک رسم ہے جس کا انسانی ترقی سے تعلق نہیں۔ یہ بھی غیر اسلامی ہے اور مغربی دنیا کے بعض ترقی یافتہ معاشرتی رجحانات بھی غیر اسلامی ہیں تو بہت کچھ مل جل گیا ہے۔ بہت سے ابہام پیدا ہو چکے ہیں اور جس طرح سونے کے تلاش کرنے والا اس لئے ریت کو رد نہیں کر دیتا کہ اس میں کہیں کہیں سونے کے ذرے ہیں بلکہ اس کو چھانتا ہے، دھوتا ہے، محنت کرتا ہے بعض کیمیائی اثرات کے ذریعے غیر سونے کو الگ کرتا ہے اور سونے کے ذرات کو الگ کرتا ہے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ پس اسلامی معاشرے کی حفاظت کے لئے اس سے زیادہ محنت کرنی پڑے تب بھی یہ درست بلکہ ضروری ہے۔

بہر حال یہ ایک ایسا مضمون ہے جس پر آج سے ہمیں نظر رکھنی ہوگی اور اگلی صدی میں مستقلاً اس راہ سے داخل ہونے والے ہر خطرے کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اسی وجہ سے میں نے بہت سے خطبات اور خطابات میں معاشرے کو اپنا موضوع بنایا اور معاشرے سے متعلق اب جرمنی میں جب خواتین کے اجلاس میں میری تقریر ہوئی تو اس میں بھی میں نے اسی موضوع پر خطاب کرتے ہوئے بہت سے پہلوؤں سے پردہ اٹھایا اور یاد کرایا کہ دیکھو جس قوم میں آ کے تم بسے ہو یعنی جرمنی قوم میں، ان کے اندر مغربی معاشرے کی بعض بدیاں بھی موجود ہیں لیکن یاد رکھو کہ تم بھی جس معاشرے کو لے کر اس ملک میں داخل ہوئی ہو تم بہت سی ایسی معاشرتی بدیاں ساتھ لائی ہو جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور وہ بدیاں بھی بڑی بھیانک ہیں۔ اس لئے تم یہ نہ سمجھنا کہ تم اسلام کی علمبردار بن کر ان کے سامنے اپنی ہر عادت کو اسلامی بنا کر پیش کر سکتی ہو۔ اگر تم ایسا کرنے کی حماقت کرو گی تو اسلام کو شدید نقصان پہنچے گا اور یہ قومیں حق رکھیں گی کہ اس معاشرے کو جس کو تم اسلام بنا کر پیش کر رہی ہو اس کو رد کر دے۔ اس کے برعکس ان کے معاشرے میں بہت سی رد کرنے کی باتیں ہیں لیکن بہت سی اچھی باتیں بھی ہیں جو ان کا معاشرتی حصہ بن چکی ہیں ان کو قبول کرنا تمہارے لئے فرض ہے اور یہ خیال کہ یہ غیر قوموں کی باتیں ہیں، انہیں ہم کیسے اپنائیں یہ بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے ہمیشہ کے لئے اس نفسیاتی روک کو دور فرما دیا جب فرمایا الحکمة ضالة المومن (ترمذی کتاب العلم حدیث نمبر: ۲۶۱۱) کہ حکمت کی بات مومن کی گمشدہ اونٹنی کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ جیسے کسی کی اونٹنی گم ہو چکی ہو اور وہ اسے ملے تو وہ اسے

غیر سمجھ کر دھتکارنہیں دیا کرتا خواہ اسے کسی غیر قوم سے ملے۔ اگر کسی عرب کی گم شدہ اونٹنی کسی دشمن قبیلے سے بھی ملتی تو وہ بڑے شوق سے اسے لے کے جاتا تھا اور لوگوں کی نظریں بچا کر لے جاتا تھا اور اپنا حق سمجھتا تھا۔ یہ کوئی عرب رسم نہیں بلکہ اس کا اطلاق انسانی فطرت پر ہوتا ہے اور ہر شخص جس کی گمی ہوئی ہر چیز جہاں بھی ملتی ہے وہ اسے اپنا حق سمجھ کر لیتا ہے۔ پس آنحضرت ﷺ نے اب ضآلۃ المومن کہہ کر حکمت کو ایک تو مومن کی ملکیت قرار دیا یعنی مومن حکمت کے لئے، حکمت کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے اور حکمت کے بغیر مومن کی کوئی حیثیت نہیں۔ مومن کا اثاثہ مومن کا مال مومن کا سب کچھ حکمت ہی ہے اور مومن کے لئے یہ ناممکن ہے کہ مومن رہتے ہوئے حکمت کی بعض باتیں کھودے۔

پس میرے نزدیک اس میں ایک پیشگوئی بھی تھی اور وہ یہ تھی کہ ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ مومن ایمان لانے کے باوجود ان حکمتوں کو گنوا بیٹھے جو میں نے اسے عطا کی ہیں جن کے متعلق قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعہ:۳) کتاب کے ساتھ حکمت نازل ہوئی اور آنحضرت ﷺ اس حکمت کے معطی بن گئے۔ اس حکمت کو عطا کرنے والے بن گئے۔ پس یہ خیال کر لینا کہ اس حدیث کا اطلاق آنحضرت ﷺ اور آپ کے غلاموں پر ہوتا تھا یہ درست نہیں ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تمام حکمتوں کی کوثر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو عطا ہوئی اور آپ نے وہ حکمتیں بانٹیں اور بڑے کھلے ہاتھوں کے ساتھ بانٹیں لیکن آئندہ ایسا ایک زمانہ آنے والا تھا کہ ان حکمت کی باتوں سے رفتہ رفتہ مسلمان غافل ہونے لگتے اور غیر قومیں انہیں اپنا لیتیں۔ پس علم کے لحاظ سے دیکھئے تو آپ کو ایک بہت لمبا صدیوں پر پھیلا ہوا دور دکھائی دے گا کہ جب مغربی قوموں نے مسلمانوں سے علم سیکھ کر اس میں ترقی کرنی شروع کی اور مسلمانوں نے وہ علم اس طرح دے دیا جس طرح انسان پھٹے پرانے کپڑے کسی کو دے دیتا ہے اور ان سے تعلق توڑ لیتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے ایک دفعہ اسی موضوع پر ایک مقالہ فرانس میں پڑھا تھا جو ریویو میں شائع ہوا۔ اگر کسی نے اس دردناک تاریخ کا مختصراً علم حاصل کرنا ہے تو وہ مقالہ جو ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا ریویو میں شائع ہوا۔ اس موضوع پر نہایت ہی عمدہ مقالہ ہے۔ آپ نے بہت تھوڑے سے صفحات پر بہت بڑی تاریخ کا خلاصہ پیش کر دیا ہے اور اس کا خلاصہ یہی ہے کہ بدقسمتی سے چند سو سال کے اندر اندر مسلمانوں نے وہ سب کچھ جو قرآن اور حدیث اور بعد کے ترقیاتی

ادوار سے سیکھا تھا لٹانا شروع کیا اور اس طرح لٹانا شروع کیا کہ مغربی قومیں دونوں ہاتھوں سے وہ علم لوٹ کر چلی گئیں اور وہ علم مسلمانوں کے پاس باقی نہ رہا۔ ورنہ علم تو ایسی چیز ہے جسے لٹایا بھی جاسکتا ہے اور اس کے باوجود قائم رہتا ہے کم نہیں ہوتا۔ آنحضرت ﷺ جب حکمتیں پھیلانے کی خاطر تشریف لائے تو حکمتوں کے پھیلانے سے آپ کی حکمت کم تو نہ ہوئی بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ علم اور حکمت پھیلانے سے بڑھتے ہیں۔

بہر حال اس حدیث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی آئندہ زمانوں پر نظر تھی اور آپ جانتے تھے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ حکمت جو مومن کی ملکیت ہے اس سے گم جائے گی اور غیر قوموں میں چلی جائے گی۔ اس وقت علماء اٹھیں گے اور کہیں گے کہ یہ مغربی علوم ہیں ان کو حاصل نہیں کرنا۔ یہ غیر قوموں کی حکمتیں ہیں ان سے پرہیز کرنا ہے۔ علماء کی یہ آوازیں تمہیں جاہل بنانے کے لئے اٹھیں گی اس وقت یاد رکھنا کہ میں محمد مصطفی ﷺ بلند آواز سے مخاطب کر کے تمہیں کہہ رہا ہوں کہ اے آنے والے مسلمانو! ان جاہل علماء کی آواز پر کان نہ دھرنا۔ یہ حکمتیں تمہاری حکمتیں ہیں۔ تم سے غیروں نے لے لی تھیں اور ان کو اپنا سمجھ کر اپنا لینا اور پھر تلافی مافات کرنا اور ان باتوں میں آگے بڑھنا اور قرآن کریم کی اس تعلیم کو یاد رکھنا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران:۱۱۱) تمہیں خیر امت بننے کے لئے نہ صرف یہ کہ اپنی کھوئی ہوئی حکمتیں واپس لینا ہوں گی بلکہ اتنی ترقی کرنی ہوگی کہ ان حکمتوں کو دوبارہ دنیا میں لوٹانا شروع کرو اور پھیلانا شروع کرو مگر اس طریق پر کہ تم اور بھی زیادہ ان علوم میں اور ان حکمتوں میں ترقی کرو جن کا فیض تم سے غیروں کی طرف جاری ہو رہا ہو۔

پس یہ وہ مضمون ہے جس کے پیش نظر میں نے ان کو متنبہ کیا کہ تم اسلام کی تعلیمات کی علمبردار تو ہو، اسلام کی تعلیمات کی اجارہ دار نہیں رہی۔ بدقسمتی سے اسلام ایک ایسے دور سے گزر چکا ہے جس میں یہ حکمتیں اسلام سے کھوئی گئیں اور غیر قوموں نے حاصل کر لیں تم جن میں آ کے بسی ہو، یہاں تمہیں وہ حکمتیں بھی نظر آئیں گے اور وہ علوم بھی دکھائی دیں گے ان کو اخذ کرنے میں ہرگز تردد نہیں کرنا اور جھوٹی لاف اور تعلّی سے کام نہیں لینا کہ ہم دنیا کو دینے کے لئے آئے ہیں۔ ہمارا معاشرہ سب سے اچھا ہے اس لئے ہم جو کچھ تمہارے لئے لے کر آئے ہیں اس کو اسی طرح قبول

کرلو۔ یہ تو قابل قبول نہیں ہے کہ پنجاب کے کسی ایک ضلع کا معاشرہ مثلاً گجرات کا معاشرہ جرمن قوموں پر ٹھونس دیا جائے کہ یہ اسلامی معاشرہ ہے۔ وہ معاشرہ جو اسلام کی تعلیم کے اکثر حصوں سے بالکل عاری ہو چکا ہو جہاں چوری عام ہو۔ جہاں جھوٹ عام ہو، جہاں دھوکہ عام ہو چکا ہو، جہاں بدنظری عام ہو۔ ہر قسم کی بیماریاں اور غلط رسوم اس طرح رائج ہو چکی ہوں کہ عملاً ایک اسلامی ملک میں ایک غیر اسلامی رواج قائم ہو چکا ہو اور غیر اسلامی سماج نے قوم کو جکڑ لیا ہو ایسی بدرسوم، ایسی بدعادات کو اسلامی معاشرہ (کے طور پر) پیش کرنے کا حق کس نے ہم لوگوں کو دیا ہے۔

پس اسی مضمون سے تعلق رکھنے کی باتیں تھیں جو میں نے اپنے رنگ میں ان کو سمجھائیں اور بتایا کہ بعض باتوں سے احتراز لازم ہے جہاں بے حیائی کی تعلیم ہے جو مغرب دے رہا ہے جہاں اور بہت سے ایسے بنیادی نقائص ہیں جو اسلام کی پاکیزہ عائلی زندگی کو مجروح کرنے والی باتیں ہیں ان سے احتراز لازم ہے لیکن دیگر اچھی باتوں سے نہ صرف یہ کہ احتراز لازم نہیں بلکہ ان کو اختیار کرنا ضروری ہے۔

پس یہ مقابلوں کے وہ میدان ہیں جو ہمارے لئے اس صدی میں کھولے جا رہے ہیں اور ان کے متعلق تمام دنیا کی جماعتوں کو ایسے مقابلوں کا انتظام کرنا چاہئے ایسے طریق اختیار کرنے چاہئیں جس سے عام احمدی کی تعلیم و تربیت ہو۔ اس کا ذہن اور اس کی قلبی صلاحیتیں اجاگر ہوں۔ صرف یہی نہیں کہ ہم نصیحت کے ذریعے اسے بتائیں کہ اسے کیا کرنا چاہئے بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ ہر جگہ کی جماعتیں اپنے اپنے ملک کے لحاظ سے ایسے Study groups بنائیں۔ ایسے صاحب عقل و فہم لوگوں کی سوسائیٹیاں قائم کریں یا ان کے ادارے قائم کریں جو ان باتوں پر غور کریں اور ہر ملک میں اس لحاظ سے ریسرچ کے کھلے میدان پڑے ہوئے ہیں۔ غانا کی رسوم اگر چہ وہ افریقہ ہے باقی افریقہ کے ممالک سے مختلف بھی ہیں، نائیجیریا کی رسوم اگر چہ وہ افریقہ ہے باقی افریقن ممالک سے مختلف بھی ہیں اور ان رسوم میں سے کچھ ایسی ہوں گی جو اسلامی مزاج رکھتی ہوں گی اور کچھ ایسی ہوں گی جو یقیناً اسلامی مزاج سے عاری بلکہ اس کے مخالف ہوں گی۔ اسی طرح جاپان کا معاشرہ ہے۔ اسی طرح چین کا معاشرہ ہے جن جن نئی قوموں میں احمدیت داخل ہوئی ہے ان میں بعض جگہ اسلام پہلے سے موجود تھا لیکن بگڑی ہوئی صورت میں۔ اس کی وجہ سے اور بھی زیادہ الجھنیں پیدا ہو چکی ہیں اور مسلمانوں کے علاقوں میں بھی غیر اسلامی رسم و رواج جڑ پکڑ چکے ہیں اور انہوں نے قومی معاشرے کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔ پس

ملکوں کے اندر بھی فرق ہے۔ غانا کے وہ علاقے جو مسلمان ہیں وہاں کے رسم ورواج ان علاقوں سے مختلف ہیں جو عیسائی ہیں اور عیسائی علاقوں کے رسم ورواج کسی حد تک ان علاقوں سے مختلف ہیں جو Pagan کہلاتے ہیں یعنی بد مذہب اور اس کے باوجود تینوں کے اندر اقدار مشترکہ بھی ہیں یعنی ایسی مشترک اقدار ہیں جو اسلامی بھی ہیں اور مشترک اقدار ایسی بھی ہیں جو کلیۃً غیر اسلامی ہیں۔ تو ایک ہی ملک کا اگر آپ تجزیہ کریں تو آپ حیران ہو جائیں گے کہ کس طرح کھچڑی پکی ہوئی ہے اور وہاں بڑی واضح نظر کے ساتھ ان امور کا مطالعہ کرنا، ان رجحانات کا تجزیہ کرنا اور اسلامی معاشرے کے نقوش کو نتھار کر اور الگ کر کے ان قوموں کے سامنے پیش کرنا ایک بہت ہی بڑا اور عالمگیر چیلنج ہے جو جماعت احمدیہ کو درپیش ہے اور جتنا اس صدی میں یہ چیلنج ابھرا ہے یا ابھرنے والا ہے ویسا پچھلی صدی میں آپ کو عشر عشیر بھی اس کے ساتھ واسطہ نہیں پڑا۔

پس اب چاہئے کہ ہم تمام ممالک میں ان امور کے اوپر غور کرنے کے لئے کمیٹیاں بنا دیں۔ بعض دانشوروں کو اس طرف متوجہ کریں بعض تحقیقات کے سیل قائم کریں اور ان میں دونوں قسم کے تحقیق کرنے والے شامل ہونے چاہئیں جہاں پاکستانی موجود ہیں ہندوستانی موجود ہیں اور اس کے علاوہ دوسری قومیں ہیں وہاں بہتر یہ ہوگا کہ کچھ پاکستانی اور ہندوستانی بھی ان قوموں کے محققین کے ساتھ شامل کر لئے جائیں اور جہاں یہ نہیں ہیں وہاں ضروری ہے کہ جو بھی تحقیق ہو اور جس نہج پر اس تحقیق کے نتائج نکلیں ان سے مرکز کو ساتھ کے ساتھ مطلع رکھا جائے تا کہ اگر کسی جگہ کوئی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا خطرہ ہے تو انہیں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ مثلاً پردہ ہے پردے میں بھی اتنے اختلافات ہیں کہ اس کی وجہ سے اب ایک بالکل نئی صورت ابھر کر سامنے آرہی ہے۔ ہمارے اپنے ملک میں بھی پردے کی دو قسمیں ہیں، کئی قسمیں ہیں لیکن نمایاں طور پر دو قسمیں ہیں۔ ایک دیہاتی پردہ اور ایک شہری پردہ۔ دیہاتی پردے میں ملانوں کے گھروں کے سوا الا ماشاء اللہ پردہ عام چادر سے کیا جاتا ہے اور روزمرہ عورتیں وہ کام کرتی ہیں جن میں برقعہ اوڑھنا ممکن ہی نہیں۔ وہ کھیتوں میں جاتیں، روزمرہ کے کام کرتیں، بھٹیار نیں دانے بھونتیں اور کئی قسم کے ایسے کاموں میں خواتین مصروف رہتی ہیں جن کے متعلق اس جگہ کے ملاں بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتے کہ یہ غیر اسلامی طرز زندگی ہے۔ اب مثلاً یہ ایک چھوٹا سا سوال ہے کہ کیا یہ واقعی غیر اسلامی طرز زندگی ہے۔ اگر نہیں تو پھر شہروں کا پردہ مختلف کیوں ہے۔ اگر مختلف ہے تو کس

حد تک اسے مختلف ہونے کا حق ہے۔ پردے کی روح کیا ہے اور کہاں کن حالات میں کس صورت میں وہ ابھرے گا۔ افریقہ میں پردے کی اور نوعیت ہے اور پردے کے مسائل مختلف ہیں۔ افریقہ میں بعض جگہ بعض مسلمان علاقوں میں پردہ اتنا سخت ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ عورت نے تنبو اوڑھا ہوا ہے وہ تنبو میں قید ہر جگہ پھر رہی ہے معلوم ہوتا کہ ان علاقوں کے علماء نے حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ (الرحمٰن: ۷۳) کی غلط تشریح سمجھی۔ وہ سمجھے کہ یہ جو قرآن کریم میں ذکر ہے کہ جنت میں حوریں ہوں گی جو خیموں کے اندر قلعہ بند ہوں گی اس سے مراد یہ ہے کہ ان کو ایسا برقعہ اوڑھا دو کہ بالکل یوں لگے کہ تنبو پھر رہا ہے اور یہی حوریں ہیں۔ محض ایک جاہلانہ تشریح ہے جس نے ایک کریہہ منظر پیدا کیا ہے کبھی آنحضرت ﷺ کے زمانے میں معاشرے نے یہ رنگ نہیں اختیار کیا تھا۔ اس کے برعکس دوسری طرف اسی ملک میں چلے جائیں تو عورتیں اس طرح پردہ سے بے نیاز ہیں کہ چھاتیاں بھی ننگی اور اس پر کوئی شرم بھی نہیں۔ یعنی یہ نہیں سمجھا جاتا کہ یہ کوئی بے شرم عورت ہے جو ننگی پھر رہی ہے۔ بلکہ کچھ غربت کے اثرات کچھ پرانے معاشرے کے اثرات وہ اس بات میں کسی قسم کی حیا محسوس ہی نہیں کرتیں نہ دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ کوئی عجیب بات ہے اب ایک ہی ملک میں یہ دو کنارے ہیں۔ اسلامی معاشرہ کیا ہے۔ وہ بیچ کی کیا راہ ہوگی جہاں ان لوگوں کو بھی کھینچ کے لانا ہوگا اور ان لوگوں کو بھی کھینچ کے لانا ہوگا۔ یہ سوال اس ملک کے لئے ایک خاص اہمیت اختیار کر جاتا ہے پس صرف پردے کو ہی آپ لے لیں تو ہر ملک کے چیلنج الگ الگ ہیں ہر ملک کے معاشرے کی شکلیں مختلف اور ان شکلوں میں سے اسلامی خدوخال تلاش کرنے ایک مختلف مسئلہ بن جاتا ہے۔

پس تمام دنیا میں جب تک مقامی طور پر ابھی سے ان امور کی طرف توجہ شروع نہ کی جائے تو آئندہ بڑے بھاری خطرات درپیش ہوں گے۔ سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ احمدیت مختلف ممالک میں مختلف برتنوں میں پڑ کر مختلف شکلیں اختیار کر جائے گی۔ احمدیت یعنی حقیقی اسلام اس کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں ایک تو پانی کی شکل کہ جس معاشرے میں جائے اس کے مطابق کچھ نہ کچھ ڈھل جائے اور ایک منجمد چیز کی شکل کہ جو ڈھل نہیں سکتی کاٹی جاتی ہے اسلام ان دونوں کے مابین چیز ہے بعض پہلوؤں سے ڈھلنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور اختیار بھی رکھتا ہے بعض پہلوؤں سے منجمد ہے اور اس معاملے میں اتنی سختی سے منجمد ہے کہ کاٹے بغیر نئی شکل اختیار کر نہیں سکتا اور کاٹنے کی اجازت نہیں ہے۔

پس ایک مثال کو لے کر پوری طرح اسلام پر چسپاں کرنا بھی ممکن نہیں دوسری مثال کو لے کر بھی اسلام پر پوری طرح چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں کے مابین ایک رستہ ہے اسے اختیار کرنا ہوگا۔

پس آج کے خطبے میں میں صرف یہی پیغام دینا چاہتا ہوں کہ تمام دنیا میں اگلی صدی کے آنے والے خطرات کو ملحوظ رکھتے ہوئے احمدیوں کی نگران کمیٹیاں مقرر کر دی جائیں جو معاشرتی پہلو سے پیش آمدہ خطرات کی نشاندہی کریں اور موجودہ یا رائج الوقت معاشرے کے خدوخال کی جانچ پڑتال کریں اور جو غیر اسلامی رسمیں ہیں ان کی نشاندہی کر کے ان کے خلاف اس ملک میں جہاد شروع کریں اور جو اسلامی رسمیں ہیں ان کی تائید میں ہوا چلانے کے لئے جدوجہد کریں اور جہاں جہاں اسلام کی مقامی معاشروں سے صلح ممکن ہے انہیں بڑی جرأت کے ساتھ اور حوصلے کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ ہوں اور ان کے متعلق اعلان کریں کہ یہ جو طرز زندگی ہے، یہ ہرگز غیر اسلامی نہیں ہے۔ یہاں صلح ہو سکتی ہے اور وہاں صلح نہیں ہو سکتی۔ یہ تمام امور ہیں جن پر ہمیں لمبا عرصہ محنت کرنی ہوگی اور ہر ملک میں محنت کرنی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے جماعت کو کہ ان نئی ذمہ داریوں کو بھی ادا کرنا ہوگا جو نئی صدی سے وابستہ ہوگئی ہیں اور وہ ایسے خطرات کی شکل میں آ رہی ہیں جو خوشخبریوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ پس یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ خوشخبریاں ہی خوشخبریاں لیتے رہیں اور اس کے ساتھ آپ کو کوئی محنت نہ کرنی پڑے کوئی خطرات لاحق نہ ہوں۔ گلاب کا پھول پھولوں کا سرتاج ہے اور اس کے ساتھ کانٹے لگے ہوتے ہیں نسبتاً کم درجے کے پھولوں کے ساتھ کانٹے نہیں بھی ہوتے مگر وہ چمن جس میں ہر قسم کے پھول ہوتے ہیں اس کا کانٹوں کے بغیر تصور نہیں ہو سکتا۔ پس ہر قسم کی خوشخبری کے ساتھ بھی کچھ کانٹے لگے ہوتے ہیں۔ ان کانٹوں کو پہچاننا ضروری ہے ان سے بچنا ضروری ہے لیکن یہ خیال کر لینا بہرحال غلط ہے کہ آپ کو ایسی خوشخبریاں ملیں گی اس صدی میں جس کے ساتھ کوئی خطرات وابستہ نہ ہوں، کوئی خطرات لاحق نہ ہوں۔

ایک اور بہت بڑا خطرہ جس کا ہمیں مقابلہ کرنا ہوگا وہ نسل پرستی کا خطرہ ہے اس موضوع پر میں انشاء اللہ آئندہ خطبے میں یا اس سے آئندہ خطبے میں روشنی ڈالوں گا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ دو بڑے چیلنج ہیں جو یہ صدی ہمارے لئے لے کر آئی ہے ان کے متعلق ہمیں ہر پہلو سے تیار رہنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے اور خود روشنی عطا کرے کیونکہ یہ رستے خطرناک ہیں۔ ان میں غلط فیصلے بھی ہو سکتے ہیں اور آج کے غلط فیصلے کل کے بہت بڑے خطرناک

رجحانات اور رسم ورواج میں تبدیل ہو جائیں گے تو دعا کرتے ہوئے، ڈرتے ہوئے اس راہ پر آگے قدم بڑھانا ہے مگر آگے ضرور بڑھانا ہے کیونکہ یہ ہماری ذمہ داری ہے اور اس سے اجتناب کی کوئی صورت ممکن نہیں۔